محمد اکرام چغتائی

قرآن کے اُردو تراجم

(ایک مختصر جائزہ)

قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہے اور اس امر مسلّمہ کے باوجود کہ الہامی زبان کا کسی غیر الہامی زبان میں ترجمہ ممکن نہیں، پھر بھی قرآن کے دنیا کی مختلف زبانوں میں اب تک ہزاروں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ان تمام ترجموں کا اصل محرک یہی رہا ہے، کہ قرآنی مطالب و مفاہیم کو اُن لوگوں تک پہنچایا جائے، جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے۔ مترجمین نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ترجمے کے لیے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے، وہ سہل اور عام فہم ہو، تاکہ عوام الناس کو قرآنی احکام اور تعلیمات کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ ان مترجمین نے بالعموم اپنے تعارفی کلمات میں اسی مقصد کی وضاحت کی ہے۔

دیگر زبانوں کی طرح قرآن مجید کے اُردو میں جو ترجمے ہوئے ہیں، اُن کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما رہا ہے، یعنی دینِ اسلام کی ترقی اور فرد و معاشرہ کی بہتری۔ اُردو میں تراجم قرآنی کی تعداد خاصی ہے اور وہ اس سلسلے میں دنیا کی کسی بھی زبان سے پیچھے نہیں۔ بعض رسائل کے قرآن نمبروں بالخصوص "جائزہ تراجم قرآنی"، (مرتبہ محمد سالم قاسمی وغیرہ، مطبوعہ دیوبند، ۱۹۶۸ء) میں ان تراجم کی جو فہرستیں مرتب ہوئی ہیں، اُن کے مطابق اُردو میں قرآن کے مکمل اور نامکمل ترجموں کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ہے۔ ان میں تفسیریں بھی شامل ہیں، اس لیے کہ شاید ہی کوئی ایسی تفسیر ہو، جس کے ساتھ ترجمہ موجود نہ ہو۔ ظاہر ہے، اس مختصر سے جائزے میں سبھی تراجم کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں صرف چیدہ چیدہ ترجموں ہی کا ذکر ممکن ہے اور وہ بھی ایسے، جنھوں نے قرآن کے اُردو تراجم کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

قرآن کے ان ترجموں کا اردو نثر کے مختلف ارتقائی مراحل سے گہرا تعلق ہے۔ بعض عوامل اور مختلف النوع تحریکوں کے زیرِ اثر اردو نثر کے اسالیبِ بیان تبدیل ہوتے رہے

اور اِن تبدیلیوں کا اثر قرآن کے اردو ترجموں پر بھی ہوا ہے۔ اس اعتبار سے اردو نثر کے مختلف ادوار اور قرآن مجید کے یہ ترجمے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، لیکن اگر نفس ترجمہ کو پیش نظر رکھا جائے تو اِن ترجموں کی الگ سے ادوار بندی کرنی پڑے گی۔ مختصراً قرآن کے اردو تراجم کو اِن تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور تو وہ ہے جسے قدیم دور کہا جا سکتا ہے اور جو دکنی دور سے شروع ہوتا ہے اور اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک چلتا ہے۔ دوسرے دور کا آغاز شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے ترجمے سے ہوتا ہے اور انیسویں صدی کے اواخر میں ختم ہوتا ہے۔ تیسرا اور آخری دور ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ترجمۂ قرآن سے لے کر دورِ حاضر تک چلتا ہے۔

موجودہ تحقیقات کے مطابق دورِ اول میں جتنے تراجم ملتے ہیں، وہ تقریباً سبھی نامکمل ہیں اور اُن کی تعداد بھی خاصی ہے۔ اگر مختلف کتب خانوں مثلاً کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کتب خانہ سالار جنگ (حیدر آباد دکن)، کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو (حیدر آباد دکن) کتب خانہ انجمن ترقی اُردو (کراچی، برٹش میوزیم (لندن) اور انڈیا آفس (لندن) کے خطی نسخوں اور مطبوعہ کتب کی فہرستوں کو کھنگالا جائے، تو ایسے بہت سے ترجموں کے حوالے مل جاتے ہیں۔ اس دور کے اکثر مترجمین نے اپنے ترجموں کو تفسیر کا نام دیا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ تفسیر کم اور ترجمے زیادہ ہیں۔ ان ترجموں میں ایک دقت یہ ہے کہ ان کی زبان قدیم اور نامانوس ہے اور دوسرے ان میں سے بیشتر ناقص الطرفین ہیں۔ اس لیے اِن کے سنہ اور دیگر کوائف کا پتہ نہیں چلتا، البتہ زبان کی قدامت اور بعض الفاظ کی املائی شکلوں سے ان کا دورِ تالیف متعین کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق قدیم ترین دکنی ترجمہ دسویں صدی ہجری کے شروع میں ہوا۔ یہ اول و آخر سے ناقص ہے اور اس میں آخری پارے کی سورتوں کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کا اندازِ بیان بھی قدیم ہے اور اس میں جو الفاظ و محاورات استعمال کیے گئے ہیں، وہ بعد کی کتابوں میں نہیں ملتے۔

اسی عہد کی ایک کتاب "شمائل الاتقیا" ہے جسے فارسی میں برہان الدین غریب کے خلیفہ رکن الدین عماد نے اپنے مرشد کی فرمائش پر ۱۳۳۷ء میں تالیف کیا اور اس کا دکنی ترجمہ میراں جی خدانما کے خلیفہ میراں یعقوب نے ۱۶۶۷ء میں کیا۔ یہ کتاب براہِ راست قرآن

کے تراجم یا تفاسیر سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن اس میں مترجم نے جا بجا قرآنی آیات کا سلیس اور نکھرے ہوئے اسلوب میں ترجمہ کیا ہے اور ان ترجموں میں عربی ترکیب نحوی اور اردو ترکیب نحوی دونوں کو برتا گیا ہے، مثلاً سورہ بنی اسرائیل کی ۸۲ ویں آیت کا ترجمہ" اور نازل کیے ہیں قرآن کو کہ وہ شفا ہور رحمت ہے مومناں کوں،،

یا سورۃ حج کی ۲۷ آیت کا ترجمہ" رضا دے لوگاں کوں حج کی جو آویں تیرے پاس،،

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان تراجم میں اردو کی نحوی ترکیب کو بھی برقرار رکھا ہے مثلاً سورۂ بقرہ کی اس آیت" یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم"، کا ترجمہ" جسے منگتا ہے اُسے سیدھی باٹ دکھلاتا ہے"، دکنی دور کی اُردو نثر بالخصوص اُس نثر میں جو فقہی اور صوفیانہ کتابوں میں استعمال ہوتی ہے، ایسی عبارتیں جا بجا مل جاتی ہیں اور یہی وہ عبارتیں ہیں. جو قرآنی تراجم کی آئندہ روایات سے گہرا تعلق رکھتی ہیں.

قرآن مجید کے اردو ترجموں کا دوسرا دور خاصا اہم ہے دراصل یہی وہ دور ہے، جس میں پہلی بار قرآن کا مکمل ترجمہ منظرِ عام پر آیا. اس دور میں اردو تراجم کی زبان سے دکنی اثرات ختم ہو گئے اور ان کی جگہ شمالی ہند کے الفاظ، محاورات اور دیگر اسالیبِ بیان نے سنبھال لی.

اس دور کا معتبر اور معروف ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلوی (وفات ۱۸۱۸ء) کا ہے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے چار بیٹوں میں سے تیسرے بیٹے تھے. انھوں نے تحصیلِ علوم اپنے والد سے کی، منقولات و معقولات پر کامل دستگاہ رکھتے تھے اور اُنھیں عربی و فارسی پر پورا عبور حاصل تھا. اُن کے تبحرِ علمی کے چرچے ہر سُو تھے، لیکن اُنکی شہرت کی بڑی وجہ قرآن کا وہ پہلا مکمل اُردو ترجمہ ہے، جو انھوں نے اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں کیا۔ یہ ترجمہ انھوں نے خود نہیں لکھا بلکہ بول کر لکھوایا۔ اُن کے ایک شاگرد سید نجف علی خاں تھے، وہ اُن سے تحت لفظی قرآن مجید پڑھتے تھے۔ جو استاد پڑھاتے، وہ ساتھ ساتھ لکھتے جاتے اور جب مکمل قرآن پڑھ چکے تو یہ استاد کی خدمت میں براہِ اصلاح پیش کر دیا.

شاہ رفیع الدین کا یہ ترجمہ لفظی ہے اور اس میں عربی کی نحوی ترکیب کا اتباع کیا گیا ہے. مترجم نے ہر لفظ کے تحت اردو کا مناسب ترین لفظ لکھ دیا ہے اور وضاحت کے لیے الفاظ بڑھانے یا ترجمے کو بامحاورہ بنانے کی کوشش نہیں کی. وہ قرآن کے متن سے ذرہ بھر اِدھر اُدھر نہیں ہوئے، اس لیے اس ترجمے میں مربوط جملے دکھائی نہیں دیتے. فارسی اور عربی ترکیب

میں مضاف پہلے ہوتا ہے اور مضاف الیہ بعد میں، جیسے غُلَامُ زَیْد۔ اس ترجمے میں اس کا لفظی ترجمہ اسی ترتیب سے کیا گیا ہے یعنی غلام زید کا۔ اسی طرح عربی میں فاعل و مفعول پر فعل مقدم ہوتا ہے مثلاً ضَرَبَ، زَیدٌ، عمروًا۔ اور اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا تھا کہ مارا زید نے عمرو کو شاہ رفیع الدین نے ترجمے میں یہی صورت باقی رکھی ہے، لیکن اس التزام کے باوجود سارے ترجمے میں کوئی لفظ مشکل سے ایسا ملے گا، جو عام فہم نہ ہو۔ لفظی ترجمہ ہونے کے باوجود یہ وہ ترجمہ ہے، جو قرآن کی روح اور اس کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

شاہ عبدالقادر دہلوی (وفات ۱۸۱۴ء) شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے اور شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی تھے۔ اپنے دور کے جیّد عالم اور متقی و پرہیز گار تھے۔ انھوں نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی تھی۔ اُن کی اصل شہرت کی بھی بڑی وجہ اُن کا ترجمۂ قرآن ہے، جو ۱۷۹۰ء میں مکمل ہوا۔

یہ ترجمہ لفظی نہیں بلکہ وضاحتی ہے۔ جملے اُردو کی نحوی ترکیب کے مطابق ہیں۔ ان میں روزمرّہ اور محاورے کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور ساتھ ساتھ عربی لفظ کے لیے موزوں اردو لفظ استعمال کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ اردو ہندی لغت کا ایک بڑا خزانہ ہے۔ شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا اس التزام کے ساتھ ترجمہ کر کے کہ اس میں مروجہ اُردو زبان کے الفاظ مترادفات و مرکبات استعمال ہوں، ایک ایسا کام کیا ہے، جس سے ایک طرف اُن کے دینی مقاصد کو تقویت پہنچی اور دوسری طرف اردو زبان میں اظہار کی غیر معمولی قوت پیدا ہوگئی۔ یہ ترجمہ لسانی اعتبار سے بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔

شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے قرآنی تراجم سے جو روایت قائم ہوئی، وہ زمانے کے ساتھ ساتھ مزید مستحکم ہوتی گئی اور ان کے تتبع میں متعدد ترجمے ہوئے، جن میں حکیم محمد شریف خاں (وفات ۱۸۰۱ء) کا ترجمۂ قرآن قابل ذکر ہے۔ یہ ترجمہ شاہ عالم بادشاہ کے کہنے پر ہوا۔ مولوی عبدالحق کی رائے میں اس ترجمے کی زبان شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں اتنی سختی نہیں کی گئی ہے، اردو زبان کی ترکیب کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ نیز شاہ صاحب کی طرح یہ ترجمہ ہندی میں نہیں ہے۔

اسی دور میں ایک اور ترجمہ فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ایما سے ہوا،

لیکن اُن کے بیماری کے باعث واپس انگلستان چلے جانے کی وجہ سے یہ ترجمہ ادھورہ رہ گیا کالج کے ایک استاد مولوی امانت اللہ شہدا نے اس ترجمے کو شروع کیا تھا اور اس میں انھیں میر بہادر علی حسینی اور کاظم علی جوان کا تعاون بھی حاصل تھا۔ یہ ترجمہ بامحاورہ اور سلیس ہے۔ مترجم نے اردو کے روزمرہ کو عمدگی سے استعمال کیا ہے، جملوں کی ترکیب عربی، نہج پر نہیں بلکہ اردو کے ڈھنگ پر ہے۔

اُردو میں قرآنی تراجم کا تیسرا دور ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ترجمۂ قرآن سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ پہلی بار ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا اور یہ اپنے بعض خصائص کی بنا پر اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ بعض لوگ اس ترجمے کو ڈپٹی نذیر احمد کی عظیم مذہبی خدمت اور اسے اردو زبان و ادب کا ایک فقید المثال کارنامہ تصور کرتے ہیں۔ اس ترجمے کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ مترجم نے زبان کو صرف بامحاورہ ہی نہیں رکھا بلکہ قوسین میں تشریحی الفاظ لکھ کر عبارت کو مسلسل و مربوط کر دیا۔

۲۔ حاشیے پر فائدے لکھے۔ ان میں شاہ عبدالقادر کی تفسیر سے مدد لی۔

۳۔ لغاتِ عربی کی تشریح الگ لکھی۔ یہ عربی داں قاریوں کے لیے مفید ہے۔

۴۔ مضامینِ قرآن کی فہرست حوالۂ آیات کے ساتھ ایسی تفصیل و تجزیہ کے ساتھ مرتب کی کہ مطالبِ قرآنی کے انداز کے ساتھ تنزیلِ الٰہی کی ضرورت و عظمت بھی بیک نظر معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز بھی اردو میں عجیب و جدید ہے۔

۵۔ محاورات کو بکثرت استعمال کیا گیا ہے اور اس میں مترجم اس قدر حدِ تجاوز سے بڑھ گئے کہ بعض مقامات پر قرآن کی سنجیدگی اور ثقاہت مجروح ہو گئی اور اسی بنا پر مختلف حلقوں کی جانب سے اُن پر شدید اعتراضات بھی کیے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے ترجمے کے وقت نذیر احمد دو اہم عناصر سے متاثر تھے، ایک عوام اور دوسرے ادبیت۔ ان دونوں عناصر نے قرآن کے اصل ترجمے سے ان کو بھٹکا دیا اور اس کمزوری نے اُن کو ایک مترجم سے ایک مفسر بنا دیا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے بعد گذشتہ پون صدی میں قرآن کے اردو تراجم کی خاصی بڑی تعداد سامنے آئی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر بنیادی طور پر تفاسیر ہیں، لیکن چونکہ ہر مفسر نے ترجمہ بھی ساتھ دیا ہے، اس لیے اِن کو تراجم قرآنی میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ایسے مترجمین میں مولانا احمد رضا

خاں بریلوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولوی عاشق الٰہی، فتح محمد جالندھری، محمود حسن دیوبندی، ابوالکلام آزاد عبدالماجد دریاآبادی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام ترجمے اپنے دور کی نثر کے اسالیبِ بیان کی ترجمانی کرتے ہیں اور ہر ایک کی یہ کوشش رہی ہے کہ مطالبِ قرآن کو آسان سے آسان تر پیرائے میں بیان کیا جائے۔ ایک بات جو تقریباً ان تمام ترجموں میں مشترک ہے، وہ ترجمے کے ساتھ قوسین میں تشریحی عبارات کا استعمال ہے۔ یہ واضح طور پر ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ان توضیحی عبارتوں سے جملوں میں ربط تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس سے ترجمہ، تفسیر کے قریب پہنچ جاتا ہے اور قوسین کی اس قدر بھرمار سے قاری کے ذہن کو دھچکے سے محسوس ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ دور قرآنی تراجم کے عروج کا دور ہے۔ اس دور میں سیکڑوں ترجمے چھپ کر سامنے آئے ہیں۔ یہ تعداد شاید اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ قرآن کے احکام اور مطالب کو کما حقہٗ اردو میں منتقل کرنا کس قدر مشکل ہے۔ یہ بھی قرآن کا ایک اعجاز اور اس کی الہامی زبان کا کمال ہے کہ وہ کامل طور پر عقلِ انسانی کی گرفت میں نہیں آتی۔

فہرستِ مآخذ:

(۱) مولوی عبدالحق: پرانی اُردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں (رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۳۷ء)

(۲) مولانا احسن مارہروی: تاریخ نثر اردو بنام تاریخی "نمونۂ منثورات"، حصہ اول، علی گڑھ ۱۹۳۰ء

(۳) حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو، کراچی ۱۹۶۶ء

(۴) محمد سالم قاسمی و دیگر (مرتب): جائزہ تراجم قرآنی، دیوبند ۱۹۶۸ء

(۵) ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، جلد دوم، حصہ دوم، لاہور ۱۹۸۲ء